ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2955

Program: BS (Islamic Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(شعبہ شریعہ، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ)

کورس: معاصر فقہی مباحث (2955) • سطح: بی ایس (علوم اسلامیہ)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ: 1 تا 4)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

کورس کا تعارف اور اس مشق کا جائزہ

معاصر فقہی مباحث (2955) بی ایس علوم اسلامیہ کا وہ کورس ہے جس میں جدید دور کے فقہی مسائل، ان کے حل کے اصول اور اجتماعی اجتہاد کے نظام کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ امتحانی مشق نمبر 1 یونٹ 1 تا 4 پر مشتمل ہے اور اس کے پانچ سوالات بالترتیب اجتماعی اجتہاد کے اداروں، اسلامی قانون کی جامعیت، بیع بالتقسیط میں قیمت کے تعین، جدید طبی مسائل اور حضرت عمرؓ و امام ابو حنیفہؒ کے شورائی اجتہاد سے متعلق ہیں۔ اس گائیڈ میں ہر سوال کا جواب تعارف، ذیلی عنوانات، جداول و اشکال اور خلاصے کے ساتھ پیش کیا گیا

ہے تاکہ طالب علم مسئلے کی پوری صورت سمجھ کر اپنے الفاظ میں جواب لکھ سکے۔ طبی و دیگر حساس موضوعات میں یہ جوابات خالص علمی مطالعہ ہیں؛ عملی مسائل میں مستند اہل علم اور مجاز اداروں سے رجوع ضروری ہے۔

سوال نمبر 1: اجتماعی اجتہاد کے ادارے اور ان کا کردار (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ معاصر فقہی مسائل کے حل کے لیے اجتماعی اجتہاد کے اداروں کا جائزہ لیں اور ان کے کردار کی وضاحت کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

جدید دور میں مسلمانوں کے سامنے ایسے مسائل کی ایک طویل فہرست موجود ہے جن کا براہ راست ذکر قدیم فقہی کتابوں میں اسی صورت میں نہیں ملتا، مثلاً بینکاری اور جدید مالیات، طبی ٹیکنالوجی کے مسائل، انشورنس، الیکٹرانک تجارت، مصنوعی ذہانت اور جینیاتی سائنس کے سوالات۔ ان مسائل کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر صرف فقہی علم سے حل نہیں ہوتے بلکہ ان کے لیے معاشیات، طب، قانون اور سائنس جیسے علوم کی ماہرانہ معلومات بھی درکار ہوتی ہیں۔ کوئی ایک فرد خواہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو، عام طور پر ان تمام شعبوں پر بیک وقت مکمل عبور نہیں رکھتا۔ اسی ضرورت کے تحت بیسویں صدی میں اجتماعی اجتہاد کا تصور مضبوط ہوا، یعنی اہل علم کا ایک منظم ادارہ مل بیٹھ کر تحقیق، مشاورت اور غور و فکر کے بعد کسی مسئلے کا شرعی حل پیش کرے۔ اس سوال میں پہلے اجتماعی اجتہاد کے مفہوم اور اس کی شرعی بنیاد کا جائزہ لیا جائے گا، پھر اہم بین الاقوامی اور قومی اداروں کا تعارف کرایا جائے گا، اور آخر میں ان اداروں کے کردار، فوائد اور حدود کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ یہ جواب خالصتاً علمی و تعلیمی مطالعہ ہے؛ کسی عملی مسئلے میں حتمی شرعی رائے کے لیے مستند اہل علم اور مجاز دار الافتاء کی طرف رجوع ہی درست طریقہ ہے۔

اجتماعی اجتہاد کا مفہوم اور شرعی بنیاد

اجتہاد سے مراد کسی شرعی حکم کی دلیل تلاش کرنے میں مجتہد کی پوری علمی کوشش صرف کرنا ہے۔ جب یہی کوشش ایک فرد کے بجائے اہلِ علم کی ایک جماعت منظم صورت میں انجام دے تو اسے اجتماعی اجتہاد کہا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد مشاورت کے اسی اصول پر ہے جو اسلامی نظام کی نمایاں خصوصیت ہے، کیونکہ مشاورت سے غلطی کا امکان کم ہوتا ہے اور فیصلے میں مختلف زاویوں سے غور شامل ہو جاتا ہے۔ تاریخِ اسلام میں اس کی مثالیں موجود ہیں: خلفائے راشدین اہم مسائل میں صحابہ کرام سے مشورہ کرتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلسِ شوریٰ اس کی روشن مثال ہے، جس کی تفصیل اسی مشق کے مانحین مثال میں بھی آئے گی۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے شاگردوں کی مجلس میں مسائل زیرِ بحث لا کر اجتماعی غور کی روایت قائم کی۔ جدید دور میں حالات کی پیچیدگی نے اس روایت کو ادارہ جاتی شکل دینا ضروری بنا دیا، کیونکہ اب ایک مسئلے میں فقہ کے ساتھ ساتھ اس کے موضوع یعنی اصل واقعے کی درست سمجھ بھی ناگزیر ہے، اور موضوع کی سمجھ اکثر دوسرے علوم کے ماہرین ہی فراہم کر سکتے ہیں۔

اجتماعی اجتہاد کی ضرورت کو ایک اور زاویے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ انفرادی فتووں میں بسا اوقات ایک ہی مسئلے پر متضاد آراء سامنے آتی ہیں جس سے عوام تذبذب کا شکار ہوتے ہیں، جبکہ کسی معتبر ادارے کی اجتماعی تحقیق کے بعد سامنے آنے والی رائے میں نسبتاً توازن، اعتماد اور قبولیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جدید مسائل اکثر کسی ایک ملک تک محدود نہیں رہتے بلکہ پوری مسلم دنیا ان سے دوچار ہوتی ہے، اس لیے بین الاقوامی سطح پر مشترکہ غور سے امت میں ایک طرح کی فکری ہم آہنگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اجتماعی رائے اجماع کے درجے کی قطعی حجت نہیں ہوتی؛ وہ ایک مضبوط علمی رائے ہوتی ہے جس پر اختلاف کی گنجائش باقی رہتی ہے، اور اداروں کے فیصلوں کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

Figure 1: How a collective ijtihad institution works



شکل 1: اجتماعی اجتہاد کے ادارے کا عمومی طریقہ کار — مسئلے کی پیش کش سے قرارداد یا فتوے کی اشاعت تک۔

اہم بین الاقوامی ادارے

بین الاقوامی سطح پر سب سے نمایاں ادارہ مجمع الفقہ الاسلامی ہے جو تنظیم تعاون اسلامی یعنی او آئی سی کے تحت جدہ میں قائم ہے۔ اس میں رکن ممالک کے نامزد کردہ فقہاء اور ماہرین شریک ہوتے ہیں اور اس کے اجلاسوں میں معاصر مسائل پر تحقیقی مقالات پیش کیے جاتے ہیں، جن پر بحث کے بعد قراردادیں منظور ہوتی ہیں۔ جدید طب، مالیات اور سماجی مسائل پر اس مجمع کی قراردادیں دنیا بھر میں حوالے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ دوسرا بڑا ادارہ مکہ مکرمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم فقہی مجمع ہے، جس میں مختلف ممالک اور مسالک کے علماء شامل ہوتے ہیں اور جو اپنے اجلاسوں میں جدید مسائل پر اجتماعی آراء پیش کرتا ہے۔ ان دونوں اداروں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں مختلف فقہی مکاتب فکر کے اہل علم ایک جگہ جمع ہوتے ہیں، جس سے کسی ایک مسلک کی تنگ نظری کے بجائے ایک وسیع تر تناظر سامنے آتا ہے اور مقالات و مناقشے کتابی صورت میں شائع ہو کر محققین کے لیے مستقل علمی سرمایہ بن جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ بحرین میں قائم اکاؤنٹنگ اینڈ آڈٹنگ آرگنائزیشن برائے اسلامی مالیاتی ادارے یعنی اے اے او آئی ایف آئی کا کردار بھی اہم ہے، جو اسلامی بینکاری اور مالیات کے لیے شرعی معیارات تیار کرتی ہے جنہیں دنیا کے بہت سے اسلامی بینک اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح ملائیشیا، متحدہ عرب امارات اور دیگر ممالک میں مرکزی بینکوں کے تحت شرعی مشاورتی کونسلیں کام کرتی ہیں جو مالیاتی مصنوعات کی شرعی جانچ کرتی ہیں۔ برصغیر میں انڈیا کی اسلامک فقہ اکیڈمی نے بھی فقہی سیمیناروں کے ذریعے بہت سے جدید مسائل پر اجتماعی غور کی روایت کو آگے بڑھایا ہے اور اس کے فیصلے اردو و عربی میں شائع ہوتے ہیں۔ یورپ میں مقیم مسلمانوں کے مسائل کے لیے بھی فقہی کونسلیں قائم ہیں جو اقلیتی فقہ کے تناظر میں رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ ان سب اداروں کا مشترکہ وصف یہ ہے کہ وہ مسئلے کو پہلے ماہرین سے سمجھتے ہیں، پھر شرعی اصولوں کی روشنی میں اس کا حل تلاش کرتے ہیں۔

قومی سطح کے ادارے: پاکستان کی مثال

پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے جس کا کام قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کے بارے میں سفارشات پیش کرنا ہے۔ کونسل میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کے ساتھ قانون اور دیگر شعبوں کے ماہرین بھی شامل ہوتے ہیں، اور اس کی سفارشات نے خاندانی قوانین، مالیاتی نظام اور دیگر شعبوں میں اہم بحث کو جنم دیا ہے۔ اس کے علاوہ وفاقی شرعی عدالت بھی آئینی دائرے میں قوانین کا شرعی جائزہ لیتی ہے، البتہ اس کا کردار اجتہادی سے زیادہ عدالتی نوعیت کا ہے۔ یونیورسٹیوں کے شعبہ جات، تحقیقی ادارے اور دار الافتاء بھی قومی سطح پر رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ پاکستان میں سود سے پاک بینکاری کے فروغ کے لیے اسٹیٹ بینک کی شرعی مشاورتی کمیٹی اور بینکوں کے شرعی بورڈز بھی اجتماعی اجتہاد ہی کی عملی صورتیں ہیں، جہاں علماء اور مالیاتی ماہرین مل کر مصنوعات کی منظوری دیتے ہیں۔

جدول 1: اجتماعی اجتہاد کے چند نمایاں ادارے اور ان کا دائرہ کار

ادارہ	مقام / وابستگی	بنیادی کردار
مجمع الفقہ الاسلامی	جدہ — تنظیم تعاون اسلامی	معاصر مسائل پر تحقیقی اجلاس اور قرار دادیں
فقہی مجمع (رابطہ عالم اسلامی)	مکہ مکرمہ	بین الاقوامی فقہی مسائل پر اجتماعی آراء
اے اے او آئی ایف آئی	بحرین	اسلامی مالیات کے شرعی معیارات کی تیاری
اسلامی نظریاتی کونسل	پاکستان — آئینی ادارہ	قوانین کے شرعی جائزے کی سفارشات
اسلامک فقہ اکیڈمی	انڈیا	فقہی سیمینار اور جدید مسائل پر اجتماعی غور

ان اداروں کا کردار

ان اداروں کا پہلا کردار جدید مسائل کی درست تفہیم ہے۔ مثال کے طور پر کسی نئی طبی ٹیکنالوجی یا مالیاتی معاہدے کا شرعی حکم جاننے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ چیز حقیقت میں ہے کیا، اس کے فوائد اور نقصانات کیا ہیں اور اس کا عملی طریقہ کار کیسا ہے۔ ادارے متعلقہ ماہرین کو بلا کر بریفنگ لیتے ہیں، جس سے حکم کی بنیاد درست واقعے پر قائم ہوتی ہے۔ دوسرا کردار متضاد آراء میں توازن پیدا کرنا ہے: مختلف مکاتب فکر کے دلائل سامنے آنے سے وہ رائے اختیار کرنا ممکن ہوتا ہے جو دلائل کی روشنی میں زیادہ مضبوط اور امت کے عمومی مصالح کے زیادہ قریب ہو۔ تیسرا کردار معیارات سازی ہے، اس طور پر اسلامی مالیات میں، جہاں یکساں شرعی معیارات نے پوری صنعت کو ایک سمت دی ہے۔ چوتھا کردار علمی ذخیرے کی تیاری ہے، کیونکہ ان اداروں کے مقالات، مناقشے اور قراردادیں آنے والے محققین کے لیے بنیادی ماخذ کا کام دیتے ہیں۔

پانچواں کردار رہنمائی کی قبولیت اور اعتماد کا ہے۔ عام مسلمان کے لیے یہ جاننا آسان ہوتا ہے کہ فلاں مسئلے پر کسی معتبر بین الاقوامی ادارے کی قرارداد موجود ہے، بجائے اس کے کہ وہ بکھرے ہوئے انفرادی فتووں میں خود فیصلہ کرے۔ چھٹا کردار بین المسالک ہم آہنگی ہے: جب مختلف مکاتب کے علماء ایک میز پر بیٹھ کر اتفاق رائے سے کوئی قرارداد منظور کرتے ہیں تو فرقہ وارانہ تناؤ کم ہوتا ہے اور امت کے مشترکہ مسائل پر اجتماعی آواز ابھرتی ہے۔ ساتویں، یہ ادارے ریاستوں اور قانون ساز اداروں کو بھی تکنیکی مدد فراہم کرتے ہیں، مثلاً اسلامی بینکاری کے قوانین یا خاندانی قوانین میں شرعی پہلوؤں کی نشاندہی۔ اس طرح اجتماعی اجتہاد صرف فتوے کا کام نہیں بلکہ علمی تحقیق، پالیسی رہنمائی اور سماجی ہم آہنگی کا ذریعہ بھی بن گیا ہے۔

طریقہ کار، فوائد اور حدود کا جائزہ

ان اداروں کا عمومی طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ پہلے مسئلہ منتخب کر کے اہل علم سے تحقیقی مقالات لکھوائے جاتے ہیں، پھر اجلاس میں ماہرین موضوع کی وضاحت کرتے ہیں، مقالات پر مناقشہ ہوتا ہے، اور آخر میں قرارداد یا اجتماعی فتویٰ منظور کر کے شائع کر دیا جاتا ہے۔ بعض مسائل میں فیصلہ موخر بھی کر دیا جاتا ہے جب مزید تحقیق درکار ہو، جو علمی احتیاط کی اچھی مثال ہے۔ فوائد میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ فیصلہ مختلف علوم اور مکاتب کے اشتراک سے ہوتا ہے، جس سے غلطی کا امکان کم اور رائے کا وزن زیادہ ہوتا

ہے۔اس کے برعکس حدود بھی واضح ہیں: بعض اداروں کے اجلاس کم تعداد میں ہوتے ہیں، بعض قراردادوں پر عمل درآمد کی کوئی لازمی قوت نہیں ہوتی، بعض اوقات سیاسی یا سرکاری اثر کی وجہ سے آزادی رائے پر سوالات اٹھتے ہیں، اور بعض مسائل میں اداروں کے درمیان خود اختلاف رائے پایا جاتا ہے جس سے عوام کے لیے انتخاب مشکل ہو جاتا ہے۔ ان حدود کے باوجود مجموعی جائزہ یہی ہے کہ اجتماعی اجتہاد دور حاضر کی ناگزیر علمی ضرورت ہے اور اس کے ادارے اس خلا کو پر کرنے کی سب سے منظم کوشش ہیں، بشرطیکہ ان کی آزادی، شفافیت اور ماہرین کی شمولیت کو مزید مضبوط کیا جائے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ معاصر فقہی مسائل کی پیچیدگی نے انفرادی اجتہاد کے ساتھ ساتھ اجتماعی اجتہاد کو ناگزیر بنا دیا ہے۔ مجمع الفقہ الاسلامی جدہ، فقہی مجمع مکہ، اے اے او آئی ایف آئی، اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان اور اس نوعیت کے دیگر ادارے تحقیق، مشاورت، معیارات سازی اور بین المسالک ہم آہنگی کا اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کا طریقہ کار ماہرین کی بریفنگ، تحقیقی مقالات، مناقشے اور قراردادوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگرچہ ان اداروں کو عمل درآمد، آزادی اور باہمی اختلاف جیسے چیلنجوں کا سامنا ہے، تاہم ان کی علمی خدمات جدید فقہ کی سب سے بڑی پیش رفت ہیں۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ جدید مسائل میں کسی معتبر اجتماعی رائے کو انفرادی اور غیر مستند آراء پر ترجیح دینی چاہیے، اور جہاں اداروں کے درمیان اختلاف ہو وہاں اہل علم کی رہنمائی میں اپنی صورت حال کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔

سوال نمبر 2: اسلامی قانون کی جامعیت اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا اطلاق (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ اسلامی قانون کی جامعیت اور افادیت پر روشنی ڈالیں اور بتائیں کہ یہ کس طرح انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اطلاق پذیر ہے۔ (20)

تمہید و تعارف

قانون سے مراد وہ اصول و ضوابط ہیں جن کے مطابق انسانی زندگی کا نظام چلتا ہے۔ ہر قانونی نظام کا دائرہ اس کے مقصد سے طے ہوتا ہے؛ جو نظام صرف ریاست اور شہری کے تعلق کو موضوع بناتا ہے اس کا دائرہ محدود رہتا ہے، جبکہ اسلامی قانون کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کی پوری زندگی کے تناظر میں دیکھتا ہے: اس کا اپنے خالق سے تعلق، اپنے نفس سے تعلق، خاندان، معاشرہ، ریاست اور پوری انسانیت سے تعلق، سب اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس سوال میں پہلے جامعیت سے مراد واضح کی جائے گی، پھر اسلامی قانون کی افادیت یعنی اس کے فوائد و مقاصد بیان ہوں گے، اور اس کے بعد عبادات، معاملات، اخلاق، خاندانی زندگی، معیشت، سیاست و عدالت اور بین الاقوامی تعلقات میں اس کے اطلاق کی تفصیل پیش کی جائے گی۔ یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ جامعیت کا مطلب ہر جزئی مسئلے کا لفظی حل موجود ہونا نہیں، بلکہ ایسے اصول، مقاصد اور اجتہادی نظام کا موجود ہونا ہے جس کی روشنی میں ہر دور اور ہر شعبے کے مسائل کا حل نکالا جا سکے۔

جامعیت سے مراد اور اس کی بنیادیں

اسلامی قانون کی جامعیت کی بنیاد اس کے ماخذ کی وسعت ہے۔ قرآن مجید زندگی کے بنیادی اصول دیتا ہے، سنت نبوی ان اصولوں کی عملی صورت دکھاتی ہے، اجماع اور قیاس و اجتہاد ان اصولوں کو نئے مسائل تک پھیلاتے ہیں، جبکہ مقاصد شریعت یعنی دین، جان، عقل، نسل اور مال کے تحفظ جیسے بڑے مقاصد ہر حکم کی سمت متعین کرتے ہیں۔ ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اسلامی قانون حکم کو صرف قانونی جبر پر نہیں چھوڑتا بلکہ اس کے ساتھ اخلاقی تربیت اور اخروی جوابدہی کا احساس بھی پیدا کرتا ہے، جس سے قانون کی پابندی محض سزا کے خوف سے نہیں بلکہ اندرونی رضا سے ہوتی ہے۔ اسی طرح اس میں عبادت اور معاملے کی تقسیم بھی دائرے کو محدود نہیں کرتی: نماز اور روزہ بھی اس کا حصہ ہیں اور خرید و فروخت، نکاح اور وراثت بھی، کیونکہ مسلمان کی نظر میں زندگی کے تمام شعبے ایک ہی دینی نظام کے تحت آتے ہیں۔ یہی ہمہ گیری اس قانون کی جامعیت کہلاتی ہے۔

Figure 2: Comprehensiveness of Islamic law across life

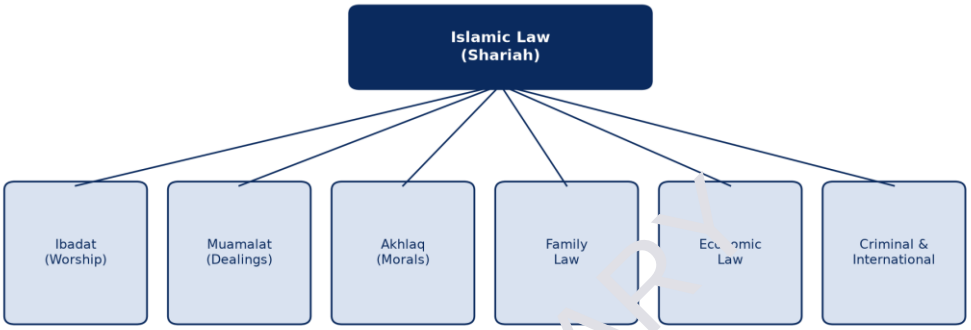

شکل 2: اسلامی قانون کے دائرے کی وسعت — عبادات سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک۔

اسلامی قانون کی افادیت

افادیت سے مراد یہ ہے کہ یہ قانون انسان اور معاشرے کے لیے کس قدر مفید اور کار آمد ہے۔ اس کی سب سے بڑی افادیت عدل کی فراہمی ہے: اس کے بنیادی اصول حاکم و محکوم، امیر و غریب اور مسلمان و غیر مسلمان کے درمیان انسانی حقوق کی بنیاد پر انصاف کا تقاضا کرتے ہیں۔ دوسری افادیت انسانی جان، مال، عزت اور عقل کا تحفظ ہے، جو مقاصد شریعت کی صورت میں باقاعدہ نظام کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔ تیسری افادیت سماجی توازن ہے: زکاۃ و صدقات کا نظام دولت کی گردش کو یقینی بناتا ہے، سود کی ممانعت استحصال کو روکتی ہے اور وراثت کے احکام دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے سے بچاتے ہیں۔ چوتھی افادیت اس کی لچک اور دوام ہے: اصول ثابت ہیں لیکن ان کے اطلاق میں عرف، ضرورت اور مصلحت کی رعایت سے ہر دور کے مسائل حل ہوتے رہتے ہیں، جس کی زندہ مثال گزشتہ چودہ صدیوں میں فقہ کی مسلسل تدوین اور جدید دور میں اجتماعی اجتہاد کے ادارے ہیں۔ پانچویں افادیت اخلاقی بنیاد ہے: جو قانون اخلاق سے خالی ہو وہ صرف کاغذی رہ جاتا ہے، جبکہ اسلامی قانون ہر حکم کے ساتھ تقویٰ اور احسان کی تربیت بھی کرتا ہے۔

عبادات، اخلاق اور انفرادی زندگی میں اطلاق

عبادات کے شعبے میں اسلامی قانون نماز، روزہ، زکاۃ اور حج کے تفصیلی احکام پیش کرتا ہے، جن میں انفرادی روحانی تربیت کے ساتھ سماجی پہلو بھی شامل ہیں؛ مثلاً زکاۃ عبادت بھی ہے اور معاشی نظام کا ستون بھی۔ اخلاق کے شعبے میں صدق، امانت، عدل، احسان، صبر اور عفو جیسے اوصاف کو صرف نصیحت نہیں بلکہ عملی زندگی کے ضوابط کے ساتھ جوڑا گیا ہے، چنانچہ جھوٹ اور خیانت صرف اخلاقی برائیاں نہیں بلکہ کئی معاملات میں قانونی نتائج بھی رکھتی ہیں، جیسے گواہی کا جھوٹا ہونا یا معاہدے میں دھوکا۔ انفرادی زندگی میں طہارت، خوراک، لباس اور روزمرہ کے معاملات کے احکام انسان کی صحت، صفائی اور نظم و ضبط کی تربیت کرتے ہیں۔ یہ پہلو اس لیے اہم ہے کہ بہت سے جدید قانونی نظام انفرادی و اخلاقی زندگی کو قانون سے باہر رکھتے ہیں، جبکہ اسلامی قانون اسے بھی اپنی جامع ترتیب میں شامل رکھتا ہے، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ خالص انفرادی اور خالق سے متعلق امور میں جزا کا اصل میدان آخرت ہے اور دنیاوی قانون زیادہ تر ان امور میں حرکت میں آتا ہے جہاں دوسروں کے حقوق متاثر ہوں۔

خاندانی، معاشی اور سماجی زندگی میں اطلاق

خاندانی زندگی میں نکاح، طلاق، حضانت، نفقہ اور میراث کے مفصل احکام موجود ہیں جو خاندان کو تحفظ دیتے ہیں اور تنازعات کی صورت میں واضح طریقہ فراہم کرتے ہیں۔ معاشی زندگی میں اسلامی قانون خرید و فروخت، اجارہ، شرکت، مضاربت، قرض اور رہن جیسے معاہدوں کے اصول دیتا ہے اور سود، غرر یعنی غیر یقینی دھوکے والے معاملات، اور جوئے کی ممانعت کے ذریعے معیشت کو استحصال سے بچاتا ہے۔ جدید دور میں اسلامی بینکاری اور تکافل اسی نظام کے اطلاق کی عملی کوششیں ہیں۔ سماجی زندگی میں ہمسائے کے حقوق، مہمان نوازی، کمزور طبقوں کی کفالت، یتیموں اور بیواؤں کا خیال اور امر بالمعروف جیسے اصول معاشرے کو باہمی ذمہ داری کا احساس دیتے ہیں۔ اسی طرح ماحولیات اور جانوروں کے حقوق کے بارے میں بھی اسلامی تعلیمات میں ایسے اصول ملتے ہیں جن سے جدید ماحولیاتی قانون سازی رہنمائی لے سکتی ہے، مثلاً اسراف کی ممانعت اور زمین کی آبادکاری کی ترغیب۔

جدول 2: زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی قانون کے اطلاق کی جھلک

شعبہ	نمایاں احکام واصول	حاصل ہونے والا فائدہ
عبادات	نماز، روزہ، زکاۃ، حج کے احکام	روحانی تربیت اور سماجی ہمدردی
خاندان	نکاح، نفقہ، حضانت، میراث	خاندانی استحکام اور حقوق کا تحفظ
معیشت	بیع، شرکت، مضاربت؛ سود و غرر کی ممانعت	استحصال سے پاک معاشی نظام
عدالت و جرم	حدود، قصاص، تعزیرات اور شہادت کے اصول	امن، عدل اور جرم کی روک تھام
ریاست و سیاست	شوریٰ، عدل، امانت اور جوابدہی کے اصول	منصفانہ حکمرانی
بین الاقوامی	معاہدوں کی پابندی، امن و جنگ کے اصول	قوموں کے درمیان اعتماد و امن

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

ریاست، عدالت اور بین الاقوامی شعبے میں اطلاق

ریاستی و سیاسی شعبے میں اسلامی قانون شوریٰ، عدل، قانون کی بالادستی اور حکمران کی جوابدہی جیسے اصول پیش کرتا ہے، جن کی تفصیلی صورتیں ہر دور کے حالات کے مطابق اجتہاد سے طے ہوتی ہیں۔ عدالتی شعبے میں شہادت کے معیارات، قاضی کی شرائط، شبہ کی صورت میں حدود کے سقوط کا اصول اور مظلوم کی دادرسی کے ادارے اس نظام کے نمایاں پہلو ہیں، جن کی کچھ تفصیل اسی کورس کی دوسری مشق میں بھی آئے گی۔ بین الاقوامی شعبے میں معاہدوں کی پابندی، سفارت کاروں کا تحفظ، جنگ میں غیر لڑنے والوں سے حسن سلوک اور امن کی ترجیح جیسے اصول صدیوں پہلے سے فقہ کی کتابوں میں سیر و بین الاقوامی قانون کے ابواب کے تحت موجود رہے ہیں۔ اس طرح اسلامی قانون صرف داخلی نظام نہیں بلکہ قوموں کے باہمی تعلقات کے لیے بھی اصول فراہم کرتا ہے۔ یہ جامعیت اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نظام کا مخاطب پوری انسانی زندگی ہے، کسی ایک خطے، قوم یا زمانے تک محدود نہیں۔

جامعیت کے بارے میں ایک ممکنہ اشکال کا جائزہ

کبھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اگر اسلامی قانون جامع ہے تو جدید مسائل، مثلاً انٹرنیٹ کی تجارت یا طبی ٹیکنالوجی، کے لفظی احکام نصوص میں کیوں نہیں ملتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جامعیت کا مطلب ہر نئی ایجاد کا نام لے کر حکم دینا نہیں ہوتا، بلکہ ایسے کلی اصولوں کا موجود ہونا ہوتا ہے جن سے ہر مسئلے کا حکم اخذ کیا جا سکے۔ جس طرح کسی ملک کا آئین ہر چھوٹے مسئلے کی تفصیل نہیں دیتا مگر قانون سازی کی بنیاد فراہم کرتا ہے، اسی طرح قرآن و سنت کے اصول، فقہی قواعد اور اجتہاد کا نظام ہر دور کے مسائل کے حل کا راستہ کھلا رکھتے ہیں۔ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ سکے، ڈاک کے نظام، ہسپتالوں، بینکاری اور بہت سے نئے مسائل ہر دور میں پیدا ہوئے اور فقہاء نے انہی اصولوں سے ان کے احکام اخذ کیے۔ البتہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اجتہاد کا عمل زندہ اور منظم رہے، ورنہ جامع اصول بھی عملی جامہ نہیں پہن سکیں گے۔

خلاصہ و نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کی جامعیت اس کے ماخذ کی وسعت، مقاصد شریعت کی رہنمائی، اخلاق و قانون کے امتزاج اور اجتہاد کے زندہ نظام پر قائم ہے۔ یہ عبادات سے بین الاقوامی تعلقات تک زندگی کے ہر شعبے میں اصول و احکام فراہم کرتا ہے اور عدل، تحفظ، توازن اور انسانی فلاح کے مقاصد سے اس کی افادیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا اطلاق ہر دور میں اس لیے ممکن رہا ہے کہ اس کے اصول ثابت اور دائمی ہیں جبکہ ان کے اطلاق کی صورتیں عرف، ضرورت اور مصلحت کی رعایت سے بدل سکتی ہیں۔ طالب علم کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جامعیت کا دعویٰ جذبات کا نہیں بلکہ نظام کا بیان ہے: اصول، ادارے اور طریقہ کار موجود ہوں تو ہر نیا مسئلہ اسی دائرے میں حل ہو سکتا ہے، اور اجتماعی اجتہاد کے ادارے اسی عملی اطلاق کی جدید مثال ہیں۔

سوال نمبر 3: بیع بالتقسیط اور قیمت کے تعین کے شرعی اصول (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ قسطوں پر بیع (بیع بالتقسیط) میں قیمت کی زیادتی یا مختلف مدتوں کے مقابلے میں قیمتوں کے تعین کے شرعی اصول کیا ہیں؟ واضح کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

بیع بالتقسیط اس خرید و فروخت کو کہتے ہیں جس میں چیز خریدار کے حوالے کر دی جاتی ہے اور قیمت نقد کے بجائے مقررہ مدت میں قسطوں کی صورت ادا کی جاتی ہے۔ آج کے دور میں یہ صورت بے حد عام ہے: گاڑیاں، گھریلو آلات، مکانات اور مشینری بڑی تعداد میں قسطوں پر خریدی جاتی ہے، کیونکہ ہر خریدار کے پاس یک مشت رقم موجود نہیں ہوتی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قسطوں والی قیمت نقد قیمت سے زیادہ رکھی جائے تو کیا یہ زیادتی سود کے حکم میں آئے گی یا جائز بیع کی قیمت کہلائے گی، اور جب مختلف مدتوں کے لیے مختلف قیمتیں پیش کی جائیں تو قیمت کے تعین کا شرعی اصول کیا ہو گا۔ اس سوال میں پہلے بیع بالتقسیط کا مفہوم اور اس کے جواز کی بحث بیان ہو گی، پھر قیمت کی زیادتی پر فقہاء کے موقف کا خلاصہ پیش کیا جائے گا، پھر قیمت کے تعین کے اصول تفصیل سے واضح کیے جائیں گے، اور آخر میں اس معاملے کی شرائط اور احتیاطیں بیان ہوں گی۔ یہ بحث خالصتاً علمی ہے؛ کسی مخصوص کمپنی یا اسکیم کے بارے میں حتمی فتویٰ مستند دار الافتاء ہی دے سکتا ہے۔

بیع بالتقسیط کا مفہوم اور فقہی پس منظر

بیع کی ایک مشہور صورت بیع مؤجل ہے جس میں قیمت کی ادائیگی بعد کی مقررہ مدت تک مؤخر ہوتی ہے۔ بیع بالتقسیط اسی کی ایک صورت ہے جس میں مؤخر قیمت ایک ساتھ کے بجائے قسطوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ادائیگی کی تاخیر بذات خود کوئی ناجائز چیز نہیں، کیونکہ شریعت نے ادھار خرید و فروخت کو جائز رکھا ہے اور قرآن مجید میں مدت مقررہ تک کے قرض و ادھار معاملے کو لکھنے کی ہدایت اسی جواز کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اصل بحث قیمت کے فرق کی ہے: قدیم فقہاء کے ہاں بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق رکھنا کیسا ہے۔ جمہور فقہاء کا رجحان یہ رہا ہے کہ اگر معاملہ طے ہوتے وقت ایک قیمت حتمی طور پر متعین کر لی جائے تو ادھار کی وجہ سے قیمت کا نقد سے زیادہ ہونا بیع کی قیمت ہے، سود نہیں، کیونکہ سود قرض پر مشروط زیادتی کو کہتے ہیں جبکہ یہاں زیادتی کسی چیز کی قیمت کا حصہ ہے اور خریدار کو مدت کی سہولت بھی مل رہی ہے۔ البتہ بعض اہل علم نے احتیاطاً اس فرق کو پسند نہیں کیا یا خاص شرائط کے ساتھ مشروط کیا، اس لیے اس مسئلے کو اختلاف فیہ مسائل میں شمار کیا جاتا ہے اور اسی لیے اجتماعی اجتہاد کے اداروں نے اس پر تفصیلی قرار دادیں منظور کی ہیں۔

قیمت کی زیادتی: سود یا قیمت؟

اس بحث کو سمجھنے کے لیے سود اور قیمت کا فرق واضح کرنا ضروری ہے۔ سود اس زیادتی کو کہتے ہیں جو قرض دی گئی رقم پر مدت کے مقابلے میں بطور شرط واپس لی جائے، جہاں اصل میں کوئی چیز خریدی یا بیچی نہیں گئی ہوتی۔ اس کے برعکس بیع بالتقسیط میں ایک حقیقی چیز کا سودا ہوتا ہے، چیز خریدار کی ملکیت میں آ جاتی ہے، اس کے نفع و نقصان کی ذمہ داری بھی اسی کی ہوتی ہے، اور بیچنے والا قیمت کی وصولی میں تاخیر کا خطرہ برداشت کرتا ہے۔ لہٰذا جمہور کے نزدیک قیمت میں مدت کے لحاظ سے فرق رکھنا سود نہیں، بشرطیکہ معاملے کی دیگر شرائط پوری ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے معاصر فقہی اداروں نے بیع مالمسیدہ کو شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر وہ معاملہ جس پر قسطوں کا نام لکھ دیا جائے جائز ہو جائے گا: اگر حقیقت میں معاملہ صرف رقم کا قرض ہو اور چیز محض کاغذی واسطہ ہو، یا قیمت کے ساتھ ایسی شرطیں ہوں جو خریدار کو سود والے جال میں پھنسا دیں، تو حکم بدل جائے گا۔ اسی لیے فقہاء نے قیمت کے تعین اور معاملے کی صورت کے لیے خاص اصول مقرر کیے ہیں، جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔

قیمت کے تعین کے شرعی اصول

پہلا اور سب سے اہم اصول یہ ہے کہ مجلس عقد یعنی معاملہ طے ہونے کے وقت ایک ہی قیمت حتمی طور پر متعین ہو۔ بیچنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ نقد قیمت اتنی ہے اور ایک سال کی قسطوں پر قیمت اتنی ہو گی، لیکن خریدار کو ان میں سے ایک صورت منتخب کر کے معاملہ اسی ایک قیمت پر پکا کرنا ہو گا۔ اگر معاملہ اس ابہام کے ساتھ طے پا جائے کہ قیمت بعد میں دیکھی جائے گی یا خریدار جب چاہے گا اس وقت کی شرح لگے گی، تو یہ جہالت اور غرر کی صورت بنتی ہے جو بیع کو فاسد کر دیتی ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ متعین قیمت پر بعد میں کسی تاخیر کی وجہ سے مزید اضافہ نہ کیا جائے۔ قسط کی ادائیگی میں دیر ہو جائے تو اصل طے شدہ قیمت سے زیادہ رقم بطور جرمانہ لینا جمہور معاصر فقہاء کے نزدیک سود کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ اب زیادتی مدت کے بدلے میں اسی باقی قیمت پر ہو رہی ہے جس کی صورت قرض پر زیادتی جیسی بن جاتی ہے۔ تاخیر کی صورت میں جو طریقے فقہاء نے تجویز کیے ہیں، مثلاً خریدار کا خیراتی صدقے کا التزام، ان کی تفصیل اور حدود بھی علمی اختلاف کا موضوع ہیں، مگر بیچنے والے کا اضافی رقم اپنے لیے لینا جائز نہیں سمجھا جاتا۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ قسطوں کی تعداد، ہر قسط کی مقدار اور ادائیگی کی تاریخیں واضح اور معلوم ہوں، تاکہ آئندہ کسی نزاع کی گنجائش نہ رہے۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ فروخت شدہ چیز معاملے کے وقت موجود اور بیچنے والے کی ملکیت و قبضے میں ہو، خاص طور پر مالیاتی اداروں کے معاملات میں اس شرط کی بہت تاکید کی گئی ہے، کیونکہ جو چیز ملکیت میں ہی نہ ہو اسے آگے بیچنا الگ سے ممنوع صورتوں میں آتا ہے۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ قیمت کا فرق مدت کے تناسب سے پہلے سے معلوم اور طے شدہ ہو، اور معاہدے میں کوئی ایسی مبہم شق نہ ہو جس سے قیمت خود بخود بدلتی رہے، مثلاً کسی بیرونی ڈیوٹی شرح سے قیمت کو جوڑ دینا۔ چھٹا اصول یہ ہے کہ قبل از وقت ادائیگی کی صورت میں اگر بیچنے والا خود رعایت دینا چاہے تو یہ اس کی رضا سے ہو سکتا ہے، لیکن پہلے سے معاہدے میں اس رعایت کو لازم شرط بنا کر قیمت کو دو صورتوں میں لٹکا دینا بھی ابہام پیدا کرتا ہے؛ اس نکتے میں بھی فقہاء کی تفصیلات موجود ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ معاملے کی ہر شق شفاف اور متعین ہونی چاہیے۔

جدول 3: نقد بیع اور بیع بالتقسیط کا موازنہ

پہلو	نقد بیع	بیع بالتقسیط
قیمت کی ادائیگی	فوری اور یک مشت	مقررہ مدت میں قسطوں کی صورت
قیمت کا تعین	عقد کے وقت ایک قیمت	عقد کے وقت ایک حتمی قیمت؛ نقد قیمت سے زیادہ ہو سکتی ہے
چیز کی ملکیت	فوراً خریدار کی	فوراً خریدار کی؛ قیمت بعد میں ادا ہوتی ہے
تاخیر پر اضافہ	سوال پیدا نہیں ہوتا	اصل قیمت پر مزید اضافہ جائز نہیں سمجھا جاتا
اہم شرط	چیز و قیمت کا معلوم ہونا	قسطیں، مدتیں اور قیمت سب پہلے سے واضح اور متعین

مختلف مدتوں کے مقابلے میں قیمتوں کا تعین

عملی بازار میں اکثر یہ صورت پیش آتی ہے کہ ایک ہی چیز کے لیے کہا جاتا ہے کہ چھ ماہ کی قسطوں پر قیمت یہ ہے، ایک سال پر یہ اور دو سال پر اس سے زیادہ۔ شرعی اصول کے اعتبار سے اس پیش کش میں بذات خود کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ خریدار معاملہ طے کرتے وقت ان میں سے ایک مدت اور اس کی قیمت کو منتخب کر کے حتمی فیصلہ کر لے۔ حرج اس وقت پیدا ہوتا ہے جب معاملہ بغیر انتخاب کے طے کر دیا جائے اور قیمت کا فیصلہ مستقبل پر چھوڑ دیا جائے، یا معاملے کے بعد مدت بڑھانے پر خود بخود اضافی قیمت عائد ہوتی رہے۔ پہلی صورت غرر اور جہالت ہے اور دوسری صورت قرض نما زیادتی بن جاتی ہے۔ اس اصول کی روشنی میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خریدار کے لیے شفافیت ضروری ہے: اسے خریداری سے پہلے یہ جاننے کا حق ہے کہ وہ سہولت کے عوض کل کتنی رقم ادا کرے گا۔ اسی لیے جدید قوانین بھی قسطوں کے اشتہارات میں کل قیمت کی وضاحت کو لازم قرار دینے کی طرف بڑھ رہے ہیں، جو شرعی شفافیت کے اصول سے ہم آہنگ ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ بیع بالتقسیط جمہور فقہاء اور معاصر فقہی اداروں کے نزدیک شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ قیمت کی زیادتی اس وقت قیمت شمار ہوتی ہے جب وہ عقد کے وقت ایک حتمی قیمت کی صورت میں متعین کر لی جائے، چیز حقیقی طور پر بیچی جائے اور ملکیت منتقل ہو۔ قیمت کے تعین کے اصولوں میں قیمت و قسطوں کا واضح و متعین ہونا، تاخیر پر مزید اضافے سے پرہیز، چیز کا بیچنے والے کی ملکیت میں ہونا اور معاہدے کی شفافیت شامل ہیں۔ مختلف مدتوں کی مختلف قیمتیں پیش کرنا جائز ہے مگر معاملہ کسی ایک قیمت پر پکا ہونا شرط ہے۔ طالب علم کو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کسی عملی اسکیم کا جائزہ اس کے مکمل معاہدے کو دیکھ کر ہی ممکن ہوتا ہے، اور حتمی رائے کے لیے مستند اہل علم سے رجوع کرنا چاہیے۔

سوال نمبر 4: جنس کا انتخاب، جنین اور اسٹیم سیلز کا شرعی موقف (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ بچے کی جنس کے انتخاب، رحم میں جنین کی کمزوری، اور اسٹیم سیلز کے استعمال کے حوالے سے شرعی موقف واضح کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

جدید طبی سائنس نے انسانی تولید اور جنین سے متعلق ایسے امکانات پیدا کر دیے ہیں جو چند دہائیاں پہلے تک موجود نہ تھے: ماں کے رحم میں ہی جنین کی جنس اور بعض بیماریوں کا پتہ چلانا، پیدائش سے پہلے جنس کا انتخاب، لیبارٹری میں تولید کی تکنیکیں، اور اسٹیم سیلز یعنی خلیات اساسیہ سے علاج کی تحقیق۔ ان پیش رفتوں نے فقہاء کے سامنے نئے سوالات کھڑے کر دیے ہیں، کیونکہ ان کا تعلق انسانی جان کی حرمت، نسل کے تحفظ اور انسانی کرامت جیسے بنیادی مقاصد سے ہے۔ اس سوال میں تین موضوعات کا علمی جائزہ لیا جائے گا: بچے کی جنس کا انتخاب، رحم میں جنین کی کمزوری یا بیماری کی صورت میں شرعی رہنمائی، اور اسٹیم سیلز کے استعمال کے احکام۔ آغاز ہی میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ جواب ایک تعلیمی و علمی مطالعہ ہے جس میں اہل علم کے معروف موقفوں کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے؛ ان موضوعات میں کسی خاندان یا مریض کی انفرادی صورت کے بارے میں حتمی شرعی فیصلہ اہل علم، معتبر طبی ماہرین اور مجاز طبی و اخلاقی کمیٹیوں کے باہمی مشورے ہی سے ہو سکتا ہے، اور یہی رویہ اس جواب میں اختیار کیا گیا ہے۔

بنیادی اصول: انسانی جان کی حرمت اور مقاصد شریعت

ان تینوں موضوعات کی بحث چند بنیادی اصولوں پر قائم ہے۔ پہلا اصول انسانی جان کی حرمت ہے: جنین بھی ایک جاندار وجود ہے جو مراحل سے گزر کر مکمل انسان بنتا ہے، اس لیے اس کے بارے میں فقہاء نے ہمیشہ احتیاط کا رویہ اختیار کیا ہے۔ دوسرا اصول نسل کا تحفظ ہے، جو مقاصد شریعت کے پانچ بڑے مقاصد میں شمار ہوتا ہے؛ نسلی اختلاط، نسب کی گڑبڑ اور خاندانی نظام کی خرابی سے بچنا ہر تولیدی تکنیک کے جائزے میں پیش نظر رہتا ہے۔ تیسرا اصول انسانی کرامت ہے: انسان کو محض تجربے یا کاروبار کی چیز نہیں بنایا جا سکتا۔ چوتھا اصول ضرورت اور حاجت کا ہے: شریعت نے شدید ضرورت کی صورت میں بعض رخصتیں دی ہیں، مگر ضرورت کا اندازہ اہل علم اور ماہرین مل کر کرتے ہیں، اور رخصت ضرورت کی حد تک ہی رہتی ہے۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ کسی نئی تکنیک کا حکم اس کی اصل حقیقت سمجھ کر دیا جاتا ہے، یعنی پہلے طبی ماہرین سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ تکنیک ہے کیا، اس کے امکانات اور خطرات کیا ہیں، پھر فقہی اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے اجتماعی اجتہاد کے اداروں نے ان مسائل پر قراردادیں منظور کی ہیں۔

بچے کی جنس کا انتخاب: علمی موقف کا خلاصہ

جنس کے انتخاب کی دو بڑی صورتیں ہیں: ایک یہ کہ قدرتی حمل سے پہلے یا لیبارٹری طریقے سے ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے لڑکے یا لڑکی کے امکانات بڑھ جائیں، اور دوسری یہ کہ حمل ٹھہرنے کے بعد جنس معلوم کر کے ناپسندیدہ جنس کی صورت میں حمل ختم کرنے کا سوچا جائے۔ دوسری صورت کے بارے میں اہل علم کا رویہ سخت احتیاط اور عمومی طور پر عدم جواز کا ہے، کیونکہ اس میں ایک موجود جنین کی زندگی کا خاتمہ آ جاتا ہے اور یہ عمل دراصل جنس کی بنیاد پر زندگی کے حق سے محروم کرنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ پہلی صورت کے بارے میں آراء میں تفصیل پائی جاتی ہے: بعض اہل علم نے اسے مطلقاً ناپسندیدہ قرار دیا ہے کیونکہ یہ تخلیق کے قدرتی نظام میں مداخلت اور صنفی ترجیح کو بڑھاوا دیتا ہے، جس کے سماجی نتائج، مثلاً جنسوں کے توازن کی خرابی، خطرناک ہو سکتے ہیں۔ بعض نے محدود صورتوں میں، مثلاً کسی جدی جینیاتی بیماری سے بچاؤ کی صورت میں جہاں بیماری کسی خاص جنس سے وابستہ ہو، طبی ضرورت کے تحت اجازت کا قول اختیار کیا ہے۔ اس اختلاف سے واضح ہوتا ہے کہ مسئلہ قطعی نہیں، اور اسی لیے کسی عملی قدم سے پہلے مستند اہل علم سے رہنمائی لینا ضروری ہے۔

جنس معلوم کرنے کے بارے میں بھی یہی احتیاط برتی جاتی ہے کہ الٹراساؤنڈ یا دیگر ذرائع سے جنس کی معلومات اگر طبی مقاصد، مثلاً جنس سے وابستہ بیماریوں کی تشخیص، کے لیے ہوں تو ان کا دائرہ الگ ہے، لیکن محض تجسس یا ترجیح کی بنیاد پر اس معلومات کو حمل کے خاتمے کے فیصلے سے جوڑنا شرعی اور انسانی اعتبار سے درست نہیں سمجھا جاتا۔ بہت سے ممالک میں قانون بھی جنس کی بنیاد پر اسقاط کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ سماجی پہلو سے یہ بات بھی اہم ہے کہ بیٹے کی غیر معمولی ترجیح ایک جاہلی ذہنیت کی یاد دلاتی ہے جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے؛ اولاد کی قدر جنس سے نہیں بلکہ نیکی اور صلاحیت سے ہوتی ہے۔ اس لیے اس موضوع پر فقہی بحث کا حاصل یہ ہے کہ طبی ضرورت کی واقعی صورتوں کو چھوڑ کر جنس کا انتخاب عمومی طور پر پسندیدہ عمل نہیں، اور اسقاط کی غرض سے اس کا استعمال ناجائز تصور کیا جاتا ہے۔

رحم میں جنین کی کمزوری یا بیماری کی صورت

سوال میں رحم میں جنین کی کمزوری سے مراد وہ صورتیں ہیں جن میں طبی معائنے سے معلوم ہو کہ جنین کسی شدید نقص، بیماری یا ایسی کمزوری کا شکار ہے جو اس کی زندگی یا صحت کو متاثر کرے گی۔ اس بحث میں فقہاء نے کئی پہلوؤں کو الگ الگ دیکھا ہے۔ پہلا پہلو تشخیص کی یقینی حیثیت کا ہے: بہت سی رپورٹیں احتمالی ہوتی ہیں، اس لیے کسی بڑے فیصلے سے پہلے تشخیص کی تصدیق اور ماہرین کی اجتماعی رائے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ دوسرا پہلو جنین کے مرحلے کا ہے: فقہی کتابوں میں روح پھونکے جانے کے مرحلے کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور اس کے بعد کی صورت کو زیادہ سنگین سمجھا جاتا ہے، چند شدید استثنائی صورتوں کے سوا جن میں ماں کی جان کو یقینی خطرہ ہو۔ تیسرا پہلو بیماری کی شدت کا ہے: بعض کمزوریاں علاج کے قابل ہوتی ہیں اور بچہ بہتر زندگی گزار سکتا ہے، جبکہ بعض نقائص زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ ان تفصیلات کی وجہ سے کوئی عمومی فارمولا ہر صورت پر نہیں لگایا جا سکتا۔

معاصر فقہی اداروں نے اس موضوع پر جو رہنمائی دی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حمل کو ختم کرنے جیسے سنگین فیصلے کی طرف جانے سے پہلے تشخیص قطعی ہو، ماہر معالجین کی کمیٹی کی رائے موجود ہو، بیماری واقعی شدید اور لاعلاج نوعیت کی ہو اور متعلقہ مرحلے کے شرعی اصول سامنے رکھے جائیں؛ ماں کی جان کے یقینی خطرے کی صورت کو فقہاء نے ہمیشہ الگ اور ترجیحی حیثیت دی ہے، کیونکہ ماں موجود اور مکمل انسان ہے اور اس کی حفاظت مقدم ہے۔ اس کے علاوہ والدین کی ذہنی و جذباتی حالت، دیگر بچوں کی ذمہ داری اور طبی سہولتوں کی دستیابی بھی مشورے میں شامل ہوتی ہے۔ طالب علم کے لیے اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ موضوع خالص علمی اختلاف اور تفصیل کا ہے، اس لیے اسے سادہ نعرے سے حل کرنے کے بجائے ہر صورت کو اہل علم اور طبی ماہرین کی مشترکہ کمیٹی کے سامنے رکھنا ہی شرعی احتیاط ہے۔ یہ جواب کسی بھی فرد کو خود سے کوئی قدم اٹھانے کی ترغیب نہیں دیتا، بلکہ مستند اداروں سے رجوع کی تاکید کرتا ہے۔

جدول 4: تینوں طبی موضوعات پر شرعی جائزے کے بنیادی نکات

موضوع	جائزے کا بنیادی نکتہ	عمومی علمی رجحان

محض ترجیح کی بنیاد پر ناپسندیدہ؛ شدید طبی ضرورت میں بعض کے نزدیک محدود گنجائش	قدرتی نظام میں مداخلت، صنفی توازن، ضرورت کی واقعی صورت	جنس کا انتخاب
جائز نہیں سمجھا جاتا؛ قوانین میں بھی ممنوع	موجود جنین کی جان کی حرمت	جنس معلوم کر کے اسقاط
کمیٹی کی رائے اور شرعی اصولوں کے تحت کیس بہ کیس فیصلہ	تشخیص کی قطعیت، مرحلہ، ماں کی جان کا خطرہ	جنین کی شدید بیماری
بالغ خلیات اور نال کے خون وغیرہ سے علاج میں وسیع گنجائش؛ جنین کو تلف کرنے والی صورتوں میں سخت اختلاف و احتیاط	خلیات کا ماخذ، جنین کی حیثیت، انسانی کرامت	اسٹیم سیل علاج و تحقیق

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

اسٹیم سیلز کا استعمال: موقف کا خلاصہ

اسٹیم سیلز وہ بنیادی خلیات ہیں جن میں جسم کے مختلف خلیات میں تبدیل ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس لیے ان سے خون، جلد اور دیگر بافتوں کے علاج کی امیدیں وابستہ ہیں۔ فقہی جائزے میں سب سے اہم فرق ان خلیات کے ماخذ کا ہے۔ ایک ماخذ بالغ انسان کے اپنے جسم، مثلاً ہڈیوں کا گودا، ہے؛ اس سے خلیات لے کر اسی مریض یا دوسرے مریض کے علاج میں استعمال کرنے پر عمومی طور پر کوئی بڑا شرعی اشکال نہیں پایا جاتا، بشرطیکہ عطیہ دہندہ کی رضامندی اور اس کی صحت کی حفاظت کا خیال رکھا جائے۔ دوسرا ماخذ پیدائش کے وقت نال اور ڈوری کا خون ہے جو عام طور پر ضائع ہو جاتا ہے؛ اس کے ذخیرہ اور علاج میں استعمال کو بھی اہل علم کی اکثریت نے جائز دائرے میں رکھا ہے۔ تیسرا اور حساس ماخذ جنینی اسٹیم سیلز ہیں جو ابتدائی جنین سے حاصل کیے جاتے ہیں، اور اس عمل میں جنین تلف ہو جاتا ہے؛ یہیں سے بحث سنگین ہو جاتی ہے، کیونکہ سوال یہ ہے کہ علاج کی امید کے لیے ایک ممکنہ انسانی زندگی کو ختم کرنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔

اس حساس صورت پر اہل علم کی آراء میں نمایاں اختلاف ہے۔ بعض اداروں اور علماء نے اسے انسانی زندگی کی حرمت کے خلاف قرار دے کر ناجائز کہا ہے۔ بعض نے انتہائی خاص شرائط کے ساتھ، مثلاً صرف ان فالتو جنینوں تک محدود رکھ کر جو تولیدی علاج کے دوران بچ رہے ہوں اور جن کا تلف ہونا بصورت دیگر بھی طے ہو، تحقیق کی محدود اجازت کا قول پیش کیا ہے، اس کے ساتھ یہ شرطیں بھی رکھی گئی ہیں کہ کاروباری استعمال نہ ہو، انسانی اعضا کی تجارت نہ ہو اور نگرانی سخت ہو۔ اس اختلاف کی موجودگی میں طالب علم کے لیے درست رویہ یہ ہے کہ وہ دونوں طرف کے دلائل سمجھے اور کسی عملی یا پالیسی فیصلے میں حتمی بات مستند فقہی اداروں اور طبی اخلاقی کمیٹیوں پر چھوڑے۔ اسی طرح انسانی کلوننگ کے ذریعے جنین تیار کر کے خلیات لینے کی صورت کو تقریباً بالاتفاق رد کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں انسانی وجود کو محض ذریعہ بنانے کا پہلو واضح ہے۔ البتہ یہ پیش رفت بھی قابل ذکر ہے کہ بالغ خلیات کو دوبارہ پروگرام کر کے اسٹیم سیل جیسی صلاحیت دینے کی تحقیق نے ایک ایسا متبادل راستہ کھول دیا ہے جس میں جنین کے تلف ہونے کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا، اور ایسی تحقیق کو شرعی نقطہ نظر سے نسبتاً قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ جنس کے انتخاب، جنین کی بیماری اور اسٹیم سیلز جیسے موضوعات میں شرعی موقف کی بنیاد جان کی حرمت، نسل کا تحفظ، انسانی کرامت، ضرورت کا اصول اور تشخیص کی قطعیت پر ہے۔ جنس کا انتخاب محض ترجیح کی بنیاد پر پسندیدہ نہیں اور جنس کی بنیاد پر اسقاط ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ جنین کی شدید بیماری کی صورتوں میں مرحلے، شدت اور ماں کی جان کے خطرے کو دیکھ کر اہل علم اور طبی کمیٹی کی مشترکہ رائے سے فیصلہ ہوتا ہے۔ اسٹیم سیلز میں ماخذ کا فرق فیصلہ کن ہے: بالغ خلیات اور نال کے خون سے علاج میں وسیع گنجائش ہے، جبکہ جنین کو تلف کرنے والی صورتوں میں سخت اختلاف اور احتیاط ہے۔ آخر میں پھر یہ تاکید ضروری ہے کہ یہ جواب تعلیمی مطالعہ ہے؛ کسی بھی عملی صورت میں مستند علماء، معالجین اور مجاز کمیٹیوں سے رجوع ہی شرعی و اخلاقی درست راستہ ہے۔

سوال نمبر 5: حضرت عمرؓ اور امام ابو حنیفہؒ کا شورائی اجتہاد (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ حضرت عمرؓ اور امام ابو حنیفہؒ کے شورائی اجتہاد کے طریقہ کار کی وضاحت کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

اجتہاد اگرچہ انفرادی علمی عمل کے طور پر بھی معروف ہے، لیکن اسلام کی ابتدائی تاریخ سے ہی اس کی ایک اجتماعی اور شورائی صورت بھی موجود رہی ہے، جس میں اہل علم اور اہل رائے مل کر مشورے سے کسی مسئلے کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اس طریقے کی دو عظیم مثالیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور خلافت اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی فقہی مجلس ہیں۔ حضرت عمرؓ ریاست کے سربراہ بھی تھے اور مجتہد صحابی بھی، اس لیے ان کا شورائی اجتہاد قانون سازی اور ریاستی پالیسی کی سطح پر نظر آتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ ایک فقیہ اور استاذ تھے، اس لیے ان کی شوریٰ خالص علمی مجلس کی صورت میں ظاہر ہوئی جس نے ایک پورا فقہی مکتب تیار کر دیا۔ اس سوال میں دونوں شخصیات کے طریقہ کار کی تفصیل، ان کی مشترک خصوصیات اور فرق، اور آج کے اجتماعی اجتہاد کے اداروں سے ان کے تعلق کو واضح کیا جائے گا۔

حضرت عمرؓ کا شورائی طریقہ کار: پس منظر

حضرت عمرؓ کا دور اسلامی ریاست کی توسیع کا دور تھا۔ عراق، شام، مصر اور فارس کے علاقے اسلامی ریاست میں شامل ہوئے تو زمین کی تقسیم، خراج کا نظام، نئے شہروں کی آبادی، فوج کی تنخواہوں کے رجسٹر یعنی دیوان کا قیام اور غیر مسلم رعایا کے حقوق جیسے بڑے بڑے مسائل سامنے آئے جن کے لفظی احکام پہلے سے موجود نہ تھے۔ حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایسے مسائل میں اکیلے فیصلہ کرنے کے بجائے مہاجرین و انصار کے سرکردہ صحابہ کو جمع کرتے، مسئلہ ان کے سامنے رکھتے، قرآن و سنت کی روشنی میں ان کی آراء لیتے اور باہمی غور کے بعد فیصلہ فرماتے۔ عراق کی فتح شدہ زمینوں کی تقسیم کا مشہور مسئلہ اسی طریقے کی مثال ہے، جہاں مشاورت کے بعد زمین کاشتکاروں کے پاس رہنے دی گئی اور اس پر خراج مقرر ہوا، جس سے ریاست کی مستقل آمدنی اور کاشتکاروں کی معیشت دونوں کا تحفظ ہوا۔ اسی طرح دیوان کی ترتیب اور ہجری تقویم کا آغاز بھی اجتماعی مشاورت کے فیصلوں میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے طریقے کی نمایاں خصوصیات

حضرت عمرؓ کے شورائی اجتہاد کی پہلی خصوصیت مشورے کی پابندی ہے: بڑے سے بڑے معاملے میں بھی آپؓ اکابر صحابہ کی مجلس سے رجوع کرتے اور کبھی اختلاف رائے کو دبانے کی کوشش نہ کرتے، بلکہ دلیل کی بنیاد پر ترجیح دیتے۔ دوسری خصوصیت مقاصد اور مصلحت پر نظر ہے: آپؓ کے فیصلوں میں امت کی عمومی بھلائی، عدل اور نظام کی استواری کو خاص اہمیت ملتی نظر آتی ہے۔ تیسری خصوصیت سابقہ نظیروں اور حضرت ابو بکرؓ کے طریقے سے رہنمائی ہے، جس سے تسلسل قائم رہتا تھا۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ مشورے کے بعد فیصلہ ہو جانے پر اسے نافذ کرنے میں استقامت دکھائی جاتی تھی، کیونکہ شورائی فیصلے کا احترام ہی اس نظام کی کامیابی ہے۔ پانچویں خصوصیت جوابدہی کا احساس ہے: آپؓ خطوط اور خطبات میں اپنے فیصلوں کی وجوہ بیان کرتے اور رعایا کو اپنے محاسبے کا حق دیتے۔ ان خصوصیات نے شورائی اجتہاد کو محض مشورے سے آگے بڑھا کر ریاستی قانون سازی کا مؤثر نظام بنا دیا، اور بعد کے فقہاء نے آپؓ کے ان فیصلوں کو مقاصدی اجتہاد کی بنیادی مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی فقہی مجلس: طریقہ کار

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کوفہ میں تدریس فرماتے تھے اور روایات کے مطابق آپ کی مجلس میں چالیس کے قریب چیدہ شاگرد شریک ہوتے تھے جن میں امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر اور دیگر ممتاز ائمہ شامل تھے۔ اس مجلس کا طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک مسئلہ پیش کیا جاتا، ہر صاحب رائے اپنی دلیل پیش کرتا، دلائل پر بھرپور مناقشہ ہوتا، کبھی بحث کئی دن جاری رہتی، اور جب کوئی رائے دلائل کی روشنی میں مستحکم ہو جاتی تو اسے تحریر کر لیا جاتا۔ اسی مجلس کی محنت سے لاکھوں مسائل کے احکام مدون ہوئے اور حنفی فقہ کی وہ وسیع کتابی روایت وجود میں آئی جو آج تک دنیا کے بڑے حصے میں رائج ہے۔ اس طریقے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں استاذ کی رائے خود بخود حتمی نہیں ہوتی تھی؛ شاگرد اختلاف بھی کرتے اور بعض اوقات شاگرد کی رائے کو ہی اختیار کر لیا جاتا، جس کی مثالیں صاحبین کے اختلافی اقوال کی صورت میں فقہ حنفی میں محفوظ ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے طریقے میں چند اصول خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ مسئلے کی فرضی صورتیں بھی زیر بحث لائی جاتی تھیں، یعنی ایسے مسائل بھی حل کیے جاتے جو ابھی واقع نہیں ہوئے تھے، تاکہ مستقبل کی رہنمائی موجود ہو؛ اسے فقہ تقدیری کہا جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کے ساتھ استحسان اور عرف کو بھی باقاعدہ

اصول کے طور پر برتا جاتا تھا، اس لیے کوفہ کے تجارتی عرف اور معاملات کی حقیقی صورت حال کو خصوصی اہمیت ملتی تھی۔ تیسرا یہ کہ مجلس میں حدیث و فقہ دونوں کے ماہر موجود ہوتے تھے، جس سے حکم کی علمی بنیاد مضبوط ہوتی تھی۔ چوتھا یہ کہ نتائج کو لکھ کر محفوظ کیا جاتا تھا، جس سے فقہ کی تدوین کا وہ عظیم سلسلہ شروع ہوا جو مسائل کی وراثت کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرتا رہا۔ یہ مجلس دراصل اجتماعی اجتہاد کا علمی ادارہ تھی، فرق صرف یہ ہے کہ آج کے ادارے رسمی اور بین الاقوامی ہیں جبکہ وہ مجلس ایک استاذ کے گرد قائم تھی۔

جدول 5: حضرت عمرؓ اور امام ابو حنیفہؒ کے شورائی اجتہاد کا موازنہ

پہلو	حضرت عمرؓ	امام ابو حنیفہؒ
حیثیت	خلیفہ و سربراہ ریاست	فقیہ و استاذ
مجلس کے ارکان	اکابر صحابہ و اہل الرائے	چیدہ شاگرد و فقہاء
مسائل کی نوعیت	ریاستی، انتظامی و قانونی	علمی، فقہی و فروعی
طریقہ	مشاورت، غور، فیصلہ اور نفاذ	مسئلہ پیش کش، مناقشہ، ترجیح اور تحریر
نتائج کی صورت	ریاستی احکام و نظام	مدون فقہی ذخیرہ و مکتب فکر
مشترک وصف	شوریٰ، دلیل کی بنیاد پر ترجیح، مصلحت امت کی رعایت	شوریٰ، دلیل کی بنیاد پر ترجیح، مصلحت امت کی رعایت

مشترک خصوصیات اور آج کے دور سے تعلق

دونوں مثالوں میں چند باتیں مشترک ہیں جو شورائی اجتہاد کا اصل سبق ہیں۔ پہلی بات یہ کہ دونوں نے انفرادی فیصلے پر اجتماعی غور کو ترجیح دی، حالانکہ دونوں ذاتی علمی مقام کی وجہ سے اکیلے بھی فیصلہ کر سکتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ دونوں مجلسوں میں اختلاف رائے کو علمی انداز میں برداشت کیا جاتا اور فیصلہ دلیل کی مضبوطی سے ہوتا تھا۔ تیسری بات

یہ کہ دونوں میں مقاصد شریعت اور لوگوں کی حقیقی ضروریات کو بنیادی اہمیت دی گئی: حضرت عمرؓ کے انتظامی فیصلے بھی اسی رنگ کے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ کا عرف واستحسان بھی اسی کی صورت ہے۔ چوتھی بات یہ کہ نتائج کو محفوظ اور نافذ کیا جاتا تھا، فیصلہ صرف زبانی مشورہ نہیں رہتا تھا۔ آج کے اجتماعی اجتہاد کے ادارے، جن کا ذکر اس مشق کے پہلے سوال میں آیا ہے، دراصل انہی دو روایتوں کی جدید شکل ہیں: ان میں بھی تحقیقی مقالات، مناقشہ، ماہرین کی شمولیت اور قراردادوں کی اشاعت کا سلسلہ اسی شورائی روح کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ فرق یہ ہے کہ آج کے مسائل میں فقہ کے ساتھ طب، معیشت اور ٹیکنالوجی کے ماہرین بھی شامل کر لیے گئے ہیں، جو اسی اصول کی توسیع ہے کہ فیصلہ ان لوگوں کے مشورے سے ہو جو مسئلے کی حقیقت کو جانتے ہوں۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے شورائی اجتہاد کو ریاستی قانون سازی کی سطح پر رائج کیا، جہاں اکابر صحابہ کی مجلس میں نئے انتظامی و قانونی مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی، مقاصد کی رعایت اور اجتماعی غور سے نکالا جاتا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ نے اسی روح کو علمی مجلس کی صورت دی، جہاں مسائل پر مناقشہ، دلائل کی ترجیح اور نتائج کی تحریری تدوین سے ایک عظیم فقہی مکتب وجود میں آیا۔ دونوں مثالوں سے یہ اصول ملتا ہے کہ اجتماعی غور انفرادی رائے سے زیادہ محفوظ، متوازن اور قابل قبول ہوتا ہے، بشرطیکہ مجلس میں اہلیت، آزادیِ رائے اور دلیل کی پابندی ہو۔ اسی لیے آج بھی نئے مسائل میں اجتماعی اجتہاد کے اداروں کو انہی اسلاف کی روایت کا تسلسل سمجھا جاتا ہے۔